INTERNATIONAL PREMIER JOURNAL OF LANGUAGES & LITERATURE (IPJLL)
VOLUME 4, ISSUE 3, 2026 p-ISSN: 3007-2336 e-ISSN: 3007-2344

DECONSTRUCTION: THEORY, INTELLECTUAL CONTEXT, AND ITS APPLICATION IN URDU POETRY AND LITERATURE

Prof. Dr. Rabia Sarfraz
drrabiasarfraz@gcuf.edu.pk
Chairperson Department of Urdu and Oriental Languages
Govt. College University, Faisalabad.

Abstract

The study titled Deconstruction: Theory, Intellectual Context, and Its Application in Urdu Poetry and Literature explores the revolutionary critical approach of deconstruction, emphasizing its transformative impact on the interpretation of texts, meanings, and the role of the author. Deconstruction, as a modern literary theory, challenges traditional hierarchies between the text and the author, enabling a multidimensional reading of literature where meanings are fluid, contested, and context-dependent. This research undertakes a comprehensive deconstructive analysis of selected Urdu short stories and novels. The short stories of Saadat Hasan Manto, Intizar Hussain, and Hameed Shahid are examined to illustrate how narrative structures, character representations, and thematic complexities are reinterpreted through the lens of deconstruction. Furthermore, novels by Qurratulain Hyder, Abdullah Hussain, and Khadija Mastoor are studied to reveal how historical, social, and cultural narratives are destabilized and reconsidered under deconstructive scrutiny .In addition, the study extends to Urdu poetry, analyzing works of Mirza Ghalib, Allama Iqbal, Jaun Elia, Ahmed Faraz, Parveen Shakir, and Kishwar Naheed. The deconstructive reading demonstrates the plurality of meanings, tensions between surface and latent expressions, and the instability of traditional interpretations of poetic texts. The research highlights how deconstruction fosters a critical engagement with both modern and classical Urdu literature, offering new perspectives on literary analysis and interpretation. Ultimately, the study concludes that deconstruction provides a framework for understanding literature not as a fixed repository of meaning but as a dynamic interplay between text, context, and reader. By applying deconstructive principles to Urdu prose and poetry, the research showcases the potential of this critical approach to expand literary discourse and challenge conventional interpretive norms.

Keywords: *Deconstruction, Jaun Elia, Literary Criticism, Qurratulain Hyder, Saadat Hasan Manto, Urdu Literature*

Corresponding Author: Prof. Dr. Rabia Sarfraz (Chairperson Department of Urdu and Oriental Languages Govt. College University, Faisalabad.)
Email: drrabiasarfraz@gcuf.edu.pk

ردِ تشکیل۔۔۔ نظریہ، فکری پس منظر اور اردو شعر و ادب پر اطلاق

ردِ تشکیل جدید ادبی تنقید کا ایک نہایت اہم اور انقلابی نظریہ ہے جس نے متن، معنی اور مصنف کے باہمی تعلق کو از سرِ نو متعین کیا۔ یہ نظریہ اس تصور کو چیلنج کرتا ہے کہ معنی کوئی مستحکم اور قطعی حقیقت ہے، بلکہ یہ اسے ایک متحرک، تغیر پذیر اور کثیر الجہتی عمل قرار دیتا ہے۔ بیسویں صدی کے نصف آخر میں ادبی تنقید کے میدان میں جو فکری انقلاب برپا ہوا، اس میں ردِ تشکیل کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ یہ نظریہ فرانسیسی فلسفی ژاک دریدا نے پیش کیا اور اس کے ذریعے مغربی فلسفے کی اس روایت پر تنقید کی جس میں معنی کو ایک مرکز یا حتمی سچائی کے ساتھ وابستہ کیا جاتا تھا۔ دریدا کے مطابق:

"There is nothing outside the text."(1)

یہ جملہ اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ انسانی فہم ہمیشہ زبان اور متن کے ذریعے تشکیل پاتی ہے، لہٰذا معنی کو کسی خارجی اور قطعی حقیقت کے طور پر نہیں دیکھا جا سکتا۔ دریدا کے نظریۂ ردِ تشکیل کا مطلب یہ ہے کہ انسانی فہم اور علم کا انحصار ہمیشہ زبان، متن اور تحریری یا گفتاری علامات پر ہوتا ہے۔ ہم جو کچھ سمجھتے ہیں یا جس کا ہم تجزیہ کرتے ہیں، وہ کسی خارجی حقیقت سے الگ نہیں بلکہ متن کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ دریدا کے مطابق معانی کو کسی قطعی اور حتمی حقیقت کے طور پر نہیں دیکھا جا سکتا کیونکہ ہر معنی زبان کے تناظر اور استعمال سے پیدا ہوتا ہے۔ زبان میں الفاظ ہمیشہ دوسرے الفاظ کے ساتھ تعلق میں ہوتے ہیں اور ایک لفظ کا مفہوم کبھی بھی مکمل یا آزاد نہیں ہوتا، بلکہ وہ سیاق و سباق اور متن کے اندر دیگر علامات سے جڑا ہوتا ہے۔ لہٰذا، جو ہم سمجھتے ہیں وہ حقیقت میں خود متن کی ایک تشکیل ہے اور کوئی ایسی "بیرونی حقیقت" یا فکسڈ معنی نہیں جو متن سے باہر ہو۔ اس نظریے کی بنیاد یہ ہے کہ متن کا ہر حصہ، ہر جملہ، ہر علامت ایک دوسرے کے ساتھ تعلق میں ہے اور انسانی فہم انہی تعلقات کے ذریعے ممکن ہوتا ہے۔ اس طرح دریدا ہمیں یہ باور کراتا ہے کہ علم اور معانی کا انحصار متن پر ہے، اور متن کے بغیر ہم کسی خارجی حقیقت تک پہنچ نہیں سکتے۔

ردِ تشکیل کا فکری پس منظر ساختیات اور مابعد ساختیات سے جڑا ہوا ہے۔ فرڈیننڈ ڈی سوسیر نے زبان کو ایک ایسا نظام قرار دیا جس میں معنی فرق کے ذریعے پیدا ہوتا ہے۔ ان کے مطابق:

"In language there are only differences without positive terms."(2)

یہ تصور اس بات کو واضح کرتا ہے کہ زبان میں کوئی مستقل معنی موجود نہیں ہوتا بلکہ ہر لفظ اپنی شناخت دوسرے الفاظ سے فرق کے ذریعے حاصل کرتا ہے۔ دریدا نے اسی تصور کو مزید وسعت دیتے ہوئے یہ واضح کیا کہ اگر معنی فرق پر مبنی ہے تو وہ کبھی بھی حتمی نہیں ہو سکتا۔

سوسیر کے مطابق زبان ایک ایسا نظام ہے جس میں معنی صرف فرق کے ذریعے پیدا ہوتے ہیں۔ ہر لفظ کی شناخت دوسرے الفاظ سے اس کے فرق کی وجہ سے ہوتی ہے، نہ کہ کسی ذاتی یا خارجی حقیقت سے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ زبان میں کوئی مستقل یا حتمی معنی موجود نہیں ہوتے۔ دیریدا نے اس تصور کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا کہ چونکہ معانی صرف فرق کے ذریعے پیدا ہوتے ہیں، اس لیے وہ کبھی بھی مکمل یا حتمی نہیں ہو سکتے۔ دریدا نے خیال کو فرق کا نام دیا، جس کا مطلب ہے کہ معنی ہمیشہ مؤخر ہوتے ہیں اور کسی لمحے میں مکمل طور پر حاصل نہیں کیے جا سکتے۔ ہر لفظ یا متن کا مطلب دوسرے الفاظ، جملوں اور سیاق و سباق کے ساتھ تعلقات میں پیدا ہوتا ہے، اور یہ تعلقات مسلسل تبدیلی اور تاخیر کے عمل میں رہتے ہیں۔ نتیجتاً، کوئی بھی معنی مستقل یا یقینی نہیں ہوتا، بلکہ ہمیشہ متن کے اندر

اور متن کے تعلقات کے ذریعے پیدا ہوتا رہتا ہے۔ دیریدا اس بات پر زور دیتا ہے کہ علم اور فہم کا انحصار صرف اور صرف متن اور زبان کے اس جال پر ہے، اور کسی بیرونی، قطعی حقیقت کو زبان یا متن کے بغیر حاصل نہیں کیا جا سکتا۔

اسی تناظر میں دریدا نے "difference" کا تصور پیش کیا اور لکھا:

"Difference is what makes the movement of signification possible."(3)

یہ تصور اس امر کو ظاہر کرتا ہے کہ معنی ہمیشہ مؤخر ہوتا رہتا ہے اور ایک لامتناہی سلسلے کا حصہ ہوتا ہے۔

ردِ تشکیل ایک ایسا تنقیدی طریقہ کار ہے جو متن کے اندر موجود تضادات، ابہامات اور معنوی کشمکش کو نمایاں کرتا ہے۔ یہ نظریہ اس بات کو مسترد کرتا ہے کہ متن کا کوئی ایک حتمی مفہوم ہو سکتا ہے، بلکہ یہ دکھاتا ہے کہ متن خود اپنے معنی کو غیر مستحکم کر دیتا ہے۔

جے ہلس ملر اس تصور کو یوں بیان کرتے ہیں:

"Deconstruction is not a dismantling of the structure of a text, but a demonstration that it has already dismantled itself.(4)

جے ہلز ملر کا نظریہ ردِ تشکیل بنیادی طور پر ادب اور زبان کے مطالعے کا ایک طریقہ ہے جو روایت اور ظاہری معانی پر سوال اٹھاتا ہے۔ آسان الفاظ میں، وہ کہتے ہیں کہ زبان اور متن کبھی بھی ایک سیدھا یا مستقل معنی نہیں دیتے۔ ہر لفظ دوسرے الفاظ کے ساتھ تعلق رکھتا ہے اور اس تعلق کی وجہ سے معنی بدلتے رہتے ہیں۔ ملر کے مطابق، ہر متن خود میں تضادات اور اختلافات رکھتا ہے، اور یہ تضادات متن کے اندر ہی اس کے معنی کو غیر مستحکم کر دیتے ہیں۔ اس نظریے میں ہم یہ نہیں مانتے کہ کوئی ایک " صحیح "یا" حتمی "مطلب موجود ہے۔ بلکہ، ہم متن کے اندر چھپے مختلف امکان اور تضادات کو تلاش کرتے ہیں، اور یہ دیکھتے ہیں کہ کس طرح متن اپنے آپ کو تحلیل کر دیتا ہے۔

ردِ تشکیل کا مقصد یہ ہے کہ ہم متن کو صرف مصنف کے ارادے یا روایتی معانی کے زاویے سے نہ دیکھیں بلکہ اس کے اندر موجود چھپے تضادات، پوشیدہ مفروضے اور زبانی کھیل کو سامنے لائیں۔ اس طرح، ہر مطالعہ نئے زاویے پیدا کرتا ہے اور ہمیں دکھاتا ہے کہ معنی مستقل نہیں بلکہ ہمیشہ حرکت میں ہیں۔ مختصر یہ کہ جے ہلز ملر کا ردِ تشکیل نظریہ زبان اور ادب کی "مستقل حقیقت" کو چیلنج کرتا ہے اور ہمیں یہ سمجھاتا ہے کہ معنی ہمیشہ متغیر، پیچیدہ اور بحث کے قابل ہیں۔ اسی طرح پال ڈی مین کے مطابق:

"The deconstruction of a text does not proceed by random doubt but by the careful teasing out of warring forces of signification."(5)

پال ڈی مین کے مطابق ردِ تشکیل ایک خاص طریقہ کار ہے جسے منظم اور سائنسی کہا جا سکتا ہے۔ اس کا مقصد کسی بھی متن کے اندر چھپے ہوئے تضادات، خامیاں یا غیر واضح معنی کو سامنے لانا ہے۔ عام طور پر ہم متن کو ایک سیدھی، واضح کہانی یا پیغام کے طور پر پڑھتے ہیں لیکن ردِ تشکیل یہ ظاہر کرتا ہے کہ ہر متن میں ایک سے زیادہ معنی ہو سکتے ہیں اور بعض اوقات وہ معنی ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں۔

یہ طریقہ صرف متن کے لفظی مطلب تک محدود نہیں رہتا، بلکہ اس بات پر بھی غور کرتا ہے کہ مصنف کے خیالات، ثقافت، زبان اور معاشرتی پس منظر کس طرح متن کی تشکیل میں شامل ہیں۔ ردِ تشکیل یہ دکھاتا ہے کہ زبان خود غیر مستحکم ہے اور الفاظ کے معانی ہمیشہ فکس نہیں ہوتے۔ اس طرح متن کو پڑھنے والا قاری ایک نئی بصیرت حاصل کرتا ہے اور متن کی سطحی سمجھ سے آگے جا سکتا ہے۔

پال ڈی مین کے مطابق ردِ تشکیل کا اصل مقصد یہ نہیں کہ متن کو تباہ کیا جائے بلکہ یہ سمجھنا ہے کہ متن کے اندر چھپے ہوئے تضادات اور متضاد معنی کس طرح موجود ہیں۔ یہ ایک ایسا عمل ہے جو ہمیں سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ ہم کسی متن کو ایک ہی طریقے سے کیوں پڑھتے ہیں اور کیوں ہم بعض باتوں کو نظرانداز کر دیتے ہیں۔ اس طرح ردِ تشکیل ہمیں متن کی گہرائی اور پیچیدگی کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے، اور ہمیں یہ احساس دلاتا ہے کہ کوئی بھی متن مکمل یا حتمی نہیں ہوتا۔ ردِ تشکیل ایک منظم اور سائنسی طریقہ کار ہے جو متن کے اندرونی تضادات کو آشکار کرتا ہے۔

ردِ تشکیل کے تناظر میں مصنف کی حیثیت ثانوی ہو جاتی ہے اور قاری کا کردار مرکزی بن جاتا ہے۔ رولاں بارتھ اس تصور کو یوں بیان کرتے ہیں:

"The birth of the reader must be at the cost of the death of the author."(6)

رولاں بارتھ کے مطابق ردِ تشکیل کے تناظر میں مصنف کی حیثیت پرانی روایتی سوچ کے مقابلے میں بدل جاتی ہے۔ روایت یہ تھی کہ مصنف کا کام سب سے اہم ہوتا ہے کیونکہ وہ متن تخلیق کرتا ہے، اور قاری صرف اس متن کو سمجھنے یا اس پر ردعمل دینے والا ہوتا ہے۔ لیکن بارتھ کہتے ہیں کہ جب ہم متن کو ردِ تشکیل کے نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں تو مصنف کا کردار ثانوی ہو جاتا ہے۔ یعنی متن کا مطلب صرف مصنف کی نیت یا اس کے خیالات تک محدود نہیں رہتا۔

اس کے برعکس قاری کا کردار مرکزی ہو جاتا ہے۔ قاری وہ ہے جو متن کو پڑھتا، اس پر غور کرتا اور مختلف معانی دریافت کرتا ہے۔ ہر قاری کا تجربہ، علم، ثقافتی پس منظر اور ذاتی سوچ متن کی تشریح میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اس نظریے کے مطابق متن کا کوئی ایک حتمی یا مقررہ مطلب نہیں ہوتا، بلکہ ہر قاری اپنے تناظر میں متن کے مختلف پہلو دیکھتا اور معنی پیدا کرتا ہے۔

بارتھ کے اس موقف سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ادب یا کوئی بھی تحریر صرف مصنف کی تخلیق نہیں بلکہ ایک فعال تعامل ہے جس میں قاری بھی حصہ لیتا ہے۔ متن اور قاری کے درمیان یہ تعامل اسے جاندار اور معنی خیز بناتا ہے۔ اس طرح ردِ تشکیل قاری کی طاقت اور آزادی کو اجاگر کرتی ہے اور یہ دکھاتی ہے کہ معنی پیدا کرنا صرف مصنف کا کام نہیں بلکہ قاری کی بھی تخلیق ہوتی ہے۔ متن کا معنی مصنف کی نیت سے آزاد ہو کر قاری کی تشریح کے ذریعے تشکیل پاتا ہے۔

ردِ تشکیل کا اطلاق اردو ادب پر نہایت مؤثر انداز میں کیا جا سکتا ہے، کیونکہ اردو ادب اپنی فطرت میں معنوی کثرت، علامتیت اور تہہ داری رکھتا ہے۔

اردو شاعری، خصوصاً غالب کے کلام میں، معنی کی کثرت نمایاں ہے۔ ایک ہی شعر مختلف تناظر میں مختلف معنی پیدا کرتا ہے، جو ردِ تشکیل کے اصولوں سے ہم آہنگ ہے۔ اس تناظر میں متن کو ایک ایسی ساخت کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے جو بظاہر ایک معنی پیش کرتی ہے مگر اندرونی طور پر کئی متضاد معانی کو اپنے اندر سموئے ہوتی ہے۔ اقبال کی شاعری میں خودی اور بے خودی، مشرق اور مغرب جیسے تصورات موجود ہیں، جو بظاہر متضاد ہیں مگر ردِ تشکیل کے ذریعے یہ واضح ہوتا ہے کہ یہ ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں اور ان کے درمیان کوئی قطعی حد قائم نہیں کی جا سکتی۔ منٹو کے افسانوں میں حقیقت اور فکشن، اخلاق اور غیر اخلاق کے درمیان موجود سرحدیں تحلیل ہو جاتی ہیں، جو ردِ تشکیل کے اصولوں کو عملی صورت میں ظاہر کرتی ہیں۔

ردِ تشکیل کی اہمیت اس بات میں مضمر ہے کہ یہ معنی کی وسعت پیدا کرتی ہے اور متن کو ایک نئے زاویے سے دیکھنے کی اجازت دیتی ہے۔ تاہم اس پر یہ تنقید بھی کی جاتی ہے کہ یہ حد سے زیادہ ابہام پیدا کرتی ہے اور بعض اوقات معنی کے مکمل انکار تک پہنچ جاتی ہے، جس سے تنقیدی عمل میں انتشار پیدا ہو سکتا ہے۔

ردِ تشکیل ایک ایسا نظریہ ہے جس نے ادبی تنقید کے بنیادی تصورات کو بدل کر رکھ دیا۔ اس نے یہ واضح کیا کہ معنی کوئی مستقل حقیقت نہیں بلکہ ایک مسلسل اور متحرک عمل ہے۔ اردو ادب میں اس نظریے کا اطلاق نہ صرف ممکن ہے بلکہ اس کے ذریعے متون کی نئی اور گہری تفہیم بھی حاصل کی جاسکتی ہے۔

منٹو کا افسانہ ٹوبہ ٹیک سنگھ تقسیمِ ہند کے منظر نامے میں شناخت کے بحران کو پیش کرتا ہے۔ بشن سنگھ نہ ہندوستان کو قبول کرتا ہے نہ پاکستان کو، جس سے قومیت/شناخت کی ٹوٹ جاتی ہے۔ پاگل کی حد بندی خود متزلزل ہو جاتی ہے کیونکہ پاگل خانے کے کردار زیادہ واضح حقیقت بیان کرتے ہیں۔ یوں متن اپنے اندر ہی اس تقسیم کو بے نقاب کرتا ہے جس پر اس کی شروعات ہوئی تھی۔ ردِ تشکیل کے زاویے سے منٹو کا بیانیہ ایک متعدد حقیقتوں کی فضا قائم کرتا ہے، جہاں کوئی واحد اخلاقی یا تاریخی فیصلہ قطعی نہیں ہوتا۔ قاری کو اس متن میں روایتی تصورات جیسے وطن/غیر وطن، عقلی/غیر عقلی کے مابین روایتی فرق کو دوبارہ سوچنے پر مجبور کیا جاتا ہے اور یوں متن کے اندر موجود تضادات سامنے آتے ہیں۔

انتظار حسین کا آخری آدمی افسانہ ماضی، حال اور اندرونی خیالات کے بیچ کے فرق کو مٹا دیتا ہے۔ ردِ تشکیل کے مطابق یہاں زمانی ترتیب منہدم ہو جاتی ہے۔ ماضیٗ حال اور حقیقتٗ افسانہ کی دوئیاں تحلیل ہو جاتی ہیں اور قاری ایک قطعی حقیقت تک نہیں پہنچ پاتا۔ متن ایک ایسی معنوی فضا بناتا ہے جو اپنی ہی روایتوں کو مشکوک بناتا ہے اور یہی اس کا تنقیدی تاثر ہے۔ یہاں قاری خود معنوی عمل میں شریک ہوتا ہے۔ وہ صرف پڑھنے والا نہیں بلکہ متن کی تہوں میں داخل ہو کر متعدد بیانیوں کو جوڑنے والا بن جاتا ہے، جس سے معنی میں نئے امکانات پیدا ہوتے ہیں۔

حمید شاہد کے افسانہ ُسورگ میں سورٗ میں ایک استعاراتی کائنات پیش کی گئی ہے جس میں سورگ (وہ جگہ جہاں سؤر گھس آئے ہیں) محض ایک داستانی منظر نہیں بلکہ اجتماعی المیے اور معاشرتی بے بسی کی علامت بن جاتا ہے۔ افسانہ آغاز سے ہی بتاتا ہے کہ جب سے تھوتھنیوں والے آئے ہیں، دکھ موت کی اذیت سے بھی زیادہ شدید اور سفاک ہو گئے ہیں۔ اس بیانیہ میں سادہ الفاظ کا استعمال معاشرتی تناظر اور انسانی حالتِ زار کو قاری کے ذہن میں واضح کرتا ہے۔ افسانے میں سؤر اور چوکیدار کتوں کی موجودگی محض حیوانی کردار نہیں، بلکہ وہ ہمارے سماجی ڈھانچے اور سیاسی بے حسی کے استعارے ہیں۔ سؤر سورگ (جنت/سکون کی جگہ) میں گھس آئے ہیں، ظاہر کرتا ہے کہ وہ عناصر جو کبھی ناپسندیدہ تھے، اب معاشرت میں جڑ پکڑ چکے ہیں اور انسانوں نے انہیں قبول یا برداشت کر لیا ہے۔ معاشرتی بے حسی، خوف، اور عدم مزاحمت کا یہ منظر انسانی فطرت کے بعض پہلوؤں کو بھی اجاگر کرتا ہے جہاں فرد یا معاشرہ ظلم، تباہی یا غیر اخلاقی طاقتوں کو کوئی چیلنج نہیں کرتا۔ حمید شاہد جدید افسانہ نگاری میں استعارے کے ذریعے سماجی و اخلاقی تضادات کو بہت گہرائی سے پیش کرتے ہیں۔ سورگ میں سور بھی اسی روایت کا حصہ ہے ۔ایک چھوٹا سا بیانیہ مگر بڑے معنی کا حامل، جس میں سادہ منظر کے نیچے انسانی معاشرت، خوف، بے بسی اور تبدیلی کے اثرات کی عکاسی ہے۔

قرۃ العین حیدر کے ناول آگ کا دریا کو ردِ تشکیل کے تناظر میں دیکھا جائے تو یہ متن تاریخ، شناخت اور تہذیب کے روایتی تصورات کو غیر مستحکم کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ بظاہر یہ ناول برصغیر کی تاریخ کو ایک تسلسل کے ساتھ پیش کرتا ہے، مگر گہرائی میں اس تسلسل کی وحدت ٹوٹتی ہوئی دکھائی دیتی ہے اور مختلف ادوار میں پھیلے ہوئے کردار اور واقعات ایک واضح اور حتمی معنی کو قائم نہیں رہنے دیتے۔ ردِ تشکیل، اس بات کو واضح کرتا ہے کہ متن کے اندر معنی ہمیشہ متغیر اور غیر یقینی ہوتے ہیں۔ آگ کا دریا میں یہی کیفیت نمایاں ہے، جہاں ایک ہی کردار مختلف تاریخی ادوار میں مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے، جس سے شناخت کا تصور مستحکم

INTERNATIONAL PREMIER JOURNAL OF LANGUAGES & LITERATURE (IPJLL)
VOLUME 4, ISSUE 3, 2026 **p-ISSN: 3007-2336 e-ISSN: 3007-2344**

نہیں رہتا بلکہ ایک مسلسل تغیر اور تشکیل کے عمل سے گزرتا ہے۔ یوں ناول اس خیال کو چیلنج کرتا ہے کہ انسان کی شناخت کوئی مستقل اور جامد حقیقت ہے۔ ناول میں تاریخ کو ایک سیدھی لکیر کے بجائے ایک پیچیدہ اور تہہ دار بیانیے کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ بظاہر مختلف ادوار ایک دوسرے سے جڑے ہوئے دکھائی دیتے ہیں مگر در حقیقت ان کے درمیان خلا اور تضادات موجود ہیں جو کسی ایک مرکزی بیانیے کو قائم نہیں رہنے دیتے۔ اس طرح تاریخ خود ایک ایسی ساخت بن جاتی ہے جو اپنے اندر ہی اپنی نفی کے عناصر رکھتی ہے۔ اسی طرح تہذیب اور ثقافت کا تصور بھی ناول میں غیر مستحکم ہو جاتا ہے۔ مختلف ادوار میں تہذیبی اقدار بدلتی رہتی ہیں اور کوئی ایک حتمی تہذیبی شناخت سامنے نہیں آتی۔ یوں آگ کا دریا ایک ایسا متن بن جاتا ہے جس میں معنی مسلسل بنتے اور بکھرتے رہتے ہیں، اور یہی ردِ تشکیل کے اصولوں کی عکاسی کرتا ہے۔

عبداللہ حسین کے ناول اداس نسلیں میں آزادی کا تصور بظاہر ایک عظیم قومی نصب العین، اجتماعی نجات اور روشن مستقبل کی علامت کے طور پر پیش کیا گیا ہے، لیکن ردِ تشکیل کے تناظر میں یہی تصور اپنی داخلی ساخت میں کئی تضادات، ابہامات اور معنی کی غیر یقینی کیفیت کو ظاہر کرتا ہے چنانچہ آزادی ایک طرف سامراجی جبر سے نجات، خود مختاری اور نئی شناخت کے قیام کا استعارہ بنتی ہے تو دوسری طرف یہی آزادی کرداروں کی ذاتی زندگیوں میں انتشار، بے معنویت اور گہری اداسی کو جنم دیتی ہے، جہاں اجتماعی سطح پر حاصل ہونے والی کامیابی انفرادی سطح پر شکست اور ٹوٹ پھوٹ میں بدلتی نظر آتی ہے۔ مزید یہ کہ ناول میں آزادی کا بیانیہ کسی ایک واضح اور حتمی معنی تک محدود نہیں رہتا بلکہ مختلف کرداروں کے تجربات، احساسات اور زاویۂ نظر کے تحت مسلسل بدلتا رہتا ہے، جس سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ آزادی کوئی مطلق اور مستحکم قدر نہیں بلکہ ایک ایسا تصور ہے جو اپنے اندر ہی اپنی نفی کے عناصر رکھتا ہے، یوں آزادی کا خواب ایک ایسی حقیقت میں تبدیل ہو جاتا ہے جو بیک وقت امید اور مایوسی، تعمیر اور انہدام، اور شناخت اور بیگانگی کے متضاد پہلوؤں کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے، اور یہی داخلی تضاد ردِ تشکیل کے اصول کے مطابق متن کو ایک کھلے اور غیر حتمی معنی کی فضا میں قائم رکھتا ہے۔

خدیجہ مستور کے ناول "آنگن" کو اگر ردِ تشکیل کے تناظر میں دیکھا جائے تو یہ متن اپنے اندر کئی متضاد معنی اور تہہ دار بیانیہ رکھتا ہے۔ ردِ تشکیل اس بات پر زور دیتا ہے کہ کوئی بھی متن ایک ہی حتمی معنی کا حامل نہیں ہوتا بلکہ اس میں مختلف اور بسا اوقات متضاد معنی پوشیدہ ہوتے ہیں۔ آنگن بظاہر ایک گھریلو اور سماجی کہانی ہے جو تقسیمِ ہند کے پس منظر میں لکھی گئی ہے لیکن ردِ تشکیل کے نقطۂ نظر سے یہ ناول محض تاریخی یا سماجی حقیقت کی عکاسی نہیں کرتا بلکہ اس کے اندر طاقت، شناخت، اور صنفی تعلقات کے پیچیدہ نظام بھی کار فرما ہیں۔ ناول میں "آنگن" ایک محفوظ اور محدود گھریلو جگہ کی علامت ہے، لیکن جب اس کو ردِ تشکیل کے تحت دیکھا جائے تو یہی آنگن جبر، پابندی اور خواتین کی محدود آزادی کی علامت بن جاتا ہے۔ یوں ایک ہی علامت دو متضاد معنوں کو جنم دیتی ہے۔ مرکزی کردار عالیہ کی نظر سے بیان ہونے والی کہانی بھی مکمل طور پر قابلِ اعتبار نہیں رہتی، کیونکہ ردِ تشکیل کے مطابق ہر بیانیہ اپنے اندر خلا اور ابہام رکھتا ہے۔ عالیہ کی معصومانہ نظر بعض حقیقتوں کو چھپا بھی لیتی ہے اور بعض کو نمایاں بھی کرتی ہے، جس سے متن میں معنی کی غیر یقینی صورتحال پیدا ہوتی ہے۔ مزید برآں ناول میں مرد اور عورت کے کرداروں کے درمیان جو واضح تقسیم دکھائی دیتی ہے، ردِ تشکیل اسے بھی چیلنج کرتی ہے۔ بظاہر مرد طاقتور اور عورت کمزور نظر آتی ہے، لیکن متن کے اندر ایسے شواہد بھی موجود ہیں جو اس تقسیم کو غیر مستحکم کر دیتے ہیں۔ اس طرح "آنگن" ایک ایسا متن بن جاتا ہے جس میں کوئی ایک حتمی معنی نہیں بلکہ معنی کی مسلسل تشکیل اور تحلیل جاری رہتی ہے، جو ردِ تشکیل کے بنیادی اصولوں کی عکاسی کرتی ہے۔

شاعری میں چونکہ زبان کی ساخت، احساسات اور علامتوں کا استعمال انتہائی حساس انداز میں ہوتا ہے، ردِ تشکیل کے اطلاق سے معنی کی کئی پرتیں سامنے آتی ہیں۔ مرزا غالب کا شعر ملاحظہ ہو:

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے میرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے (7)

یہ شعر مرزا غالب کی غزل کے اشعار میں سے ہے اور انسانی خواہشات کی لامتناہی نوعیت اور ان کی تکمیل کی ناپائیداری کو بہت خوبصورتی سے پیش کرتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ انسان کی زندگی میں ہزاروں خواہشیں ہوتی ہیں، اور ہر خواہش اتنی شدید ہوتی ہے کہ اسے پورا کرنے کے لیے جان تک نکل سکتی ہے، یعنی خواہش کی شدت اتنی زیادہ ہے کہ اس کا انجام اکثر انسانی برداشت سے باہر ہوتا ہے۔ "بہت نکلے میرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے" کے مصرعے میں شاعر اپنے ارمانوں کی کثرت کے باوجود ان کی تکمیل کی کمی کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ انسان کی زندگی کی ایک عام حقیقت کو بیان کرتا ہے کہ خواہشات جتنی بھی ہوں، ان کی تکمیل ہمیشہ محدود رہتی ہے۔ یہاں "کم نکلے" نہ صرف مادی یا عملی ناکامی کو ظاہر کرتا ہے بلکہ روحانی اور جذباتی سطح پر بھی انسان کی تسکین کی کمی کو اجاگر کرتا ہے۔ شاعر نے زبان اور تشبیہات کی مدد سے خواہش اور ارمان کے درمیان تضاد کو خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔ "دم نکلے" کا محاورتی استعمال خواہش کی شدت اور زندگی کی ناپائیداری کو بیان کرتا ہے۔ اس شعر کی ساخت اور تشبیہ انسانی فطرت کے پیچیدہ جذبات کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے، اور قاری کو اپنے ارمانوں کی فطرت اور حدود پر غور کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ غالب کا یہ شعر فلسفیانہ بھی ہے کیونکہ یہ انسانی زندگی کی ناپائیداری، خواہشات کی لامتناہی نوعیت، اور مکمل اطمینان کی کمی کو اجاگر کرتا ہے۔ یہ شعر نہ صرف ذاتی جذبات بلکہ عمومی انسانی تجربے کی عکاسی بھی کرتا ہے، جس کی وجہ سے یہ آج بھی ہر دور کے قاری کے لیے معنی رکھتا ہے۔ اس طرح یہ شعر انسانی خواہشات اور ارمانوں کی پیچیدگی، ان کی تکمیل کی کمی، اور زندگی میں تسکین کی محدودیت کو مختصر مگر گہرے انداز میں بیان کرتا ہے۔ مرزا غالب کے اس شعر کا ردّ تشکیلی مطالعہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ خواہش اور تکمیل کا تعلق سادہ نہیں بلکہ تضاد سے بھرا ہوا ہے۔ بظاہر شاعر خواہشوں کی کثرت اور ان کی شدت بیان کرتا ہے، مگر ساتھ ہی ''بہت نکلے'' اور ''کم نکلے'' ایک دوسرے کی نفی کرتے ہیں۔ یعنی تکمیل بھی ناکافی ہے۔ یہاں خواہش کبھی ختم نہیں ہوتی بلکہ اپنی تکمیل کے باوجود نئی کمی پیدا کرتی ہے۔ اس طرح شعر یہ دکھاتا ہے کہ انسانی خواہش ایک لامتناہی عمل ہے، جہاں حاصل اور محرومی ایک ساتھ موجود رہتے ہیں اور کوئی حتمی اطمینان ممکن نہیں رہتا۔

علامہ محمد اقبال کا شعر دیکھیے:

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے (8)

یہ شعر اقبال کی فلسفیانہ بصیرت کی عکاسی کرتا ہے اور انسانی خودی کی اہمیت کو نمایاں کرتا ہے۔ شاعر ہمیں یہ پیغام دیتا ہے کہ انسان کو اپنی خودی، یعنی اپنی اندرونی قوت، ارادے اور شخصیت کو اتنا بلند کرنا چاہیے کہ تقدیر بھی اس کی مرضی سے متاثر ہو۔ یہاں خودی کا مفہوم محض غرور یا خودپسندی نہیں بلکہ ایک ایسی خوداعتمادی اور باطنی طاقت ہے جو انسان کو تقدیر کے فیصلوں سے آزاد کر دیتی ہے اور اسے اپنے اعمال اور فیصلوں کا خود مختار بناتی ہے۔ "ہر تقدیر سے پہلے" کے لفظوں کا انتخاب یہ واضح کرتا ہے کہ انسان کی کوشش اور خودی کی بلندی اس کی زندگی میں تقدیر کے فیصلوں سے پہلے اثر ڈال سکتی ہے۔ یعنی تقدیر محض لکھی ہوئی چیز

نہیں بلکہ انسان کی محنت، ارادے اور شعور سے متاثر ہو سکتی ہے۔ اس سے قاری میں ایک فعال کردار کی سوچ پیدا ہوتی ہے، جہاں انسان کو صرف تقدیر پر انحصار کرنے والا نہیں بلکہ اپنی تقدیر کا خالق بنایا گیا ہے۔ دوسرے مصرعے "خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے" میں اقبال نے یہ خیال پیش کیا کہ اگر انسان اپنی خودی کو بلند کر لے تو خدا بھی اس کی رضا کے مطابق نظامِ کائنات کے فیصلے کرے گا۔ یہ تصور انسان کی خودارادیت اور ذاتی ذمہ داری کو اہمیت دیتا ہے۔ اس میں انسانی شعور اور خودی کی اعلیٰ طاقت کے فلسفے کو فروغ دیا گیا ہے، جو فرد کو اپنے اعمال اور ارادوں کے ذمے دار بناتا ہے۔ یہ شعر اقبال کی اس فکر کی نمائندگی کرتا ہے کہ انسان کو خودی کی بلندی اور باطنی طاقت حاصل کرنی چاہیے تاکہ وہ تقدیر کے بندھن سے آزاد ہو اور اپنی زندگی میں فعال کردار ادا کر سکے۔

اقبال کے اس شعر کو اگر ردِّ تشکیل کے حوالے سے دیکھیں تو سادہ الفاظ میں اس کا مطلب یہ نہیں رہتا جو بظاہر نظر آتا ہے بلکہ اس کے اندر چھپے تضادات اور سوالات سامنے آتے ہیں۔

اس شعر میں بظاہر یہ کہا جا رہا ہے کہ انسان اپنی خودی کو اتنا بلند کر لے کہ وہ تقدیر پر اثر انداز ہو جائے، حتیٰ کہ خدا بھی اس سے پوچھے۔ لیکن ردِّ تشکیلی نقطۂ نظر سے چند اہم باتیں سامنے آتی ہیں: شعر میں خدا اور بندے کے درمیان جو فرق (حاکم اور محکوم) ہے، وہ کمزور ہوتا نظر آتا ہے۔ یعنی بندہ اتنا طاقتور دکھایا گیا ہے کہ خدا بھی اس سے سوال کرتا ہے۔

یہاں ایک تضاد پیدا ہوتا ہے کہ اگر خدا سب سے بالا ہے تو پھر وہ بندے سے کیوں پوچھے؟

اسی طرح تقدیر جو پہلے سے طے شدہ مانی جاتی ہے، اسے بھی غیر یقینی بنا دیا گیا ہے، کیونکہ بندے کی مرضی کو اس پر غالب دکھایا گیا ہے۔

ردِّ تشکیل کے مطابق اس شعر کا ایک مطلب یہ بھی نکلتا ہے کہ انسان کی آزادی اور خدا کی حاکمیت ایک دوسرے کے مقابل آ جاتی ہیں، اور کوئی ایک حتمی سچ ثابت نہیں رہتا۔

یعنی سادہ الفاظ میں یہ شعر خود اپنے اندر ہی اس خیال کو مضبوط بھی کرتا ہے (خودی کی طاقت) اور کمزور بھی کرتا ہے (خدا کی برتری پر سوال)، اور یہی ردِّ تشکیل کی اصل پہچان ہے۔

میں شاید تم کو یکسر بھولنے والا ہوں
شاید جانِ جاں شاید
کہ اب تم مجھ کو پہلے سے زیادہ یاد آتی ہو
ہے دل غمگیں بہت غمگیں
کہ اب تم یاد دلدارانہ آتی ہو(9)

جون ایلیا کی یہ نظم محبت، یاد، اور جدائی کے پیچیدہ جذبات کو بہت نفاست کے ساتھ پیش کرتی ہے۔ شاعر ابتدا میں کہتا ہے کہ وہ شاید محبوب کو مکمل طور پر بھول جائے گا، مگر اسی شاید میں اُس کی داخلی غیر یقینی کیفیت پوشیدہ ہے۔ لفظ ''شاید'' خود ایک جذباتی تعلق اور یاد کی طاقت کو ظاہر کرتا ہے۔ یعنی شاعر کا دل چاہتا ہے بھول جائے، مگر یادیں بڑھتی جا رہی ہیں، نہ کم ہوتی ہیں۔ ایسے دو متضاد جذبات — بھولنے کی کوشش اور زیادہ یاد آنے کی حقیقت — اس نظم کو قاری کے لیے

ایک اثر انگیز اور گہرے معنی والا بناتے ہیں۔ یہ نظم یاد، فراق، اور انسانی دل کی پیچیدہ کیفیت کو سادہ مگر مؤثر انداز میں بیان کرتی ہے، جو اردو ادب میں ایک مستند مقام رکھتی ہے۔

احمد فراز کا شعر ہے:

سنا ہے لوگ اسے آنکھ بھر کے دیکھتے ہیں
سو اس کے شہر میں کچھ دن ٹھہر کے دیکھتے ہیں(10)

یہ شعر محبوب کی کشش اور شہرت پر مبنی ہے، مگر ردِ تشکیل کے زاویے سے "سنا ہے" کا استعمال معنی میں عدم قطعیت اور تشکیک کو ظاہر کرتا ہے۔ حقیقت/افواہ اور تجربہ/بیان کے مابین تضاد قاری کو معنی کے متعدد امکانات کی طرف لے جاتا ہے۔

پروین شاکر کا شعر ہے

وہ تو خوشبو ہے ہواؤں میں بکھر جائے گا
مسئلہ پھول کا ہے پھول کدھر جائے گا(11)

محبوب کی غیر مرئی تشبیہ۔۔۔ خوشبو۔۔۔ ایک مستقل وجود کی بجائے علامت اور عدم ثبات کی نمائندگی کرتی ہے۔ پھول/خوشبو، جسم/روح اور وجود/عدم کے مابین فرق یہاں خود معنی کو متعدد سطحوں پر کھولتا ہے۔

کشور ناہید لکھتی ہیں:

یہ درد کی کہانی بھی عجیب ہے
خاموشیوں میں آوازاں کی بھی گونج ہے(12)

یہ شعر درد اور خاموشی کی متضاد حکایت پیش کرتا ہے۔ خاموشی کے اندر آواز کی گونج معنی کی عدمِ استحکام اور کشادگی کو ظاہر کرتی ہے۔ متن ایک متحرک معنوی عمل بن جاتا ہے جس میں قاری کی شمولیت ضروری ہے۔

درج بالا مثالوں سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اردو ادب کی شاعری، افسانہ اور ناول میں معنی ہمیشہ غیر مستحکم، کثیر المعنوی اور تغیر پذیر ہوتے ہیں۔ ردِ تشکیل اس امر کو واضح کرتی ہے کہ متن کے اندر موجود تضادات، binary oppositions اور ابہام قاری کے لیے معنوی نئی پرتیں پیدا کرتے ہیں۔ یوں اردو ادب کے متن کو لا محدود، کھلا اور متحرک معنوی عمل کے طور پر سمجھنا ممکن ہے، اور ہر متن اپنے اندر اپنی نفی اور نئی تعبیر کے امکانات رکھتا ہے۔ اس سے نہ صرف قاری کی تفہیمی صلاحیت میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ ادبی متن کی پیچیدگی اور گہرائی بھی مزید روشن ہوتی ہے۔

پاکستانی اردو نثر اور شاعری کے مطالعے کے بعد یہ امر بطورِ مجموعی نتیجہ سامنے آتا ہے کہ یہاں معنی کی تشکیل کسی سادہ، قطعی اور یک رُخی عمل کا نام نہیں بلکہ ایک پیچیدہ، تہہ دار اور مسلسل تغیر پذیر عمل ہے۔ پاکستانی ادبی متون—خواہ وہ شاعری ہوں یا افسانے اور ناول—اپنے اندر ایسے لسانی، فکری اور ثقافتی عناصر سموئے ہوتے ہیں جو معنی کو ایک مقررہ دائرے میں مقید نہیں رہنے دیتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان متون کی تفہیم ہر دور اور ہر قاری کے ساتھ ایک نئی صورت اختیار کرتی ہے۔

ردّ تشکیل کے تناظر میں مصنف کی بالادستی ختم ہو جاتی ہے اور قاری معنی کی تشکیل میں مرکزی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔اس پس منظر میں پاکستانی اردو ادب کا متن بھی ایک ایسا میدان بن جاتا ہے جہاں معنی کسی ایک مرکز کے تابع نہیں رہتے بلکہ مختلف قرأتوں کے ذریعے مسلسل تشکیل پاتے رہتے ہیں۔ متن کے اندر موجود تضادات، ابہام اور خاموشیاں نئی معنوی پرتوں کو جنم دیتی ہیں اور بظاہر مستحکم بیانیہ کو غیر یقینی بنا دیتی ہیں۔

پاکستانی ادب میں موجود تضاد——جیسے روایت/جدت، مذہب/سیکولرزم، مرکز/حاشیہ، اور شناخت/بیگانگی——بھی ردّ تشکیل کے عمل میں اپنی قطعی حیثیت کھو دیتی ہیں۔ متن کے اندر ہی یہ تضاد ایک دوسرے میں مدغم ہوتے اور اپنی سرحدیں توڑتے نظر آتے ہیں، جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ معنی کسی ایک حتمی سچائی کے تابع نہیں بلکہ ایک مسلسل تغیر پذیر عمل ہے۔یہی عمل پاکستانی ادب کو فکری وسعت اور معنوی گہرائی عطا کرتا ہے۔

چنانچہ مجموعی طور پر یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ پاکستانی اردو نثر اور شاعری کو ایک لامحدود، لامرکز اور متحرک معنوی نظام کے طور پر سمجھنا زیادہ قرینِ قیاس ہے۔ ہر متن اپنے اندر اپنی نفی اور نئی تخلیق کے امکانات رکھتا ہے اور ہر نئی قرأت اس کے معنی کو از سرِ نو مرتب کرتی ہے۔اس طرح ردّ تشکیل نہ صرف متن کی پوشیدہ جہات کو بے نقاب کرتی ہے بلکہ اردو شعر و ادب کی معنوی وسعت اور اس کی تخلیقی حرکیات کو بھی واضح کرتی ہے۔

References

1.Derrida, Jacques. Of Grammatology. Translated by Gayatri Chakravorty Spivak, Johns Hopkins University Press, 1976, p. 158.
2.Saussure, Ferdinand de. Course in General Linguistics. Translated by Wade Baskin, McGraw-Hill, 1966,p121.
3.Derrida, Jacques. Margins of Philosophy. Translated by Alan Bass, University of Chicago Press, 1982,p160.
4.Miller, J. Hillis. Theory Now and Then. Duke University Press, 1991, p. 95.
5.De Man, Paul. Allegories of Reading: Figural Language in Rousseau, Nietzsche, Rilke, and Proust. Yale University Press, 1979, p. 17.
6.Barthes, Roland. Image-Music-Text. Translated by Stephen Heath, Hill and Wang, 1977, p. 148.
7.Ghalib, Mirza. Diwan-e-Ghalib, Lahore:Maktaba Meri Library,n.d,p43.
8.Iqbal, Muhammad, Kulliyat-e-Iqbal(Urdu), Lahore: Iqbal Academy Pakistan,2013,p57.
9.Elia, Jaun. Shayed,Lahore: Al-Hamd Publications, 2007,P312.
10.Faraz, Ahmed. Dard-e-Ashob. Lahore: Maktaba-e-Karwan, 2006, p. 45.
11.Shakir, Parveen. Khushbu. Karachi: Ilmi Kitab Khana, 1976, p. 32.
12.Nahid, Kishwar. Kaman-e-Bahisht. Karachi: Oxford University Press, 1992, p. 61.